

سیرت امام حسن مجتبیٰ (ع)

<"xml encoding="UTF-8?">

امام حسن (ع) کی ولادت ۲ یا ۳ ہجری میں ہوئی۔ رسول کی وفات کے وقت ساتواں یا آٹھواں برس تھا اور ان کی یہ عمر پوری پیغمبر خدا کے غزوات کی عمر ہے۔ ۲ ہ میں جنگ بدر ہوئی اور اس کے بعد ان کی عمر کے ساتھ غزوات کی فہرست آگے بڑھی۔ جس طرح علی کی پرورش پیغمبر کی گود میں تبلیغ اسلام کے ساتھ ویسے ہی حسن مجتبیٰ کی پرورش رسول کی گود میں رسول کے غزوات اور اپنے والد (حضرت علی (ع) مرتضیٰ) کے فتوحات کے ساتھ۔ ان کے بچپن کی کہانیاں اور سوتے وقت کی لوریاں گویا یہی تھیں کہ علی (ع) کسی جہاد سے واپس آئے ہیں۔ حضرت فاطمہ زرا سے تذکرہ ہو رہا ہے خندق میں یہ ہوا۔ یہ تذکرے کانوں میں پڑ رہے ہیں اور آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں وہ یہ کہ دشمنوں کے خون میں بھری ہوئی تلوار ہے اور سیدہ عالم اسے صاف کر رہی ہیں۔ پیغمبر کے ارشادات بھی گوش زد ہو رہے ہیں کبھی معلوم ہوا کہ آج نانا نے والد بزرگوار کے لئے کہا:

ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ۔ کبھی سنا فرمایا: لَأَعْطِينَ أَرَايَةَ غَدًا رَجُلًا غَيْرَ قَرَارٍ يَجِبُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ... کبھی ملک کی صدا گوش زد ہوئی: لَا فَتْنِي إِلَّا عَلِيٌّ لَا سَيْفَ إِلَّا ذُو الْفَقَارِ۔ ان تذکروں کے علاوہ بس ہے تو عبادت اور سخاوت کی مثالوں کا مشاہدہ۔ یہ ہے سات آٹھ برس کا حسن (ع) کا رسول کی زندگی میں دور حیات۔ سات آٹھ برس کی عمر کے بچے چاہے معاملات میں عملی حصہ نہ لیں اور ادب و حفظ مراتب کی بنا پر بزرگوں کے سامنے گفتگو میں بھی شرکت نہ کریں مگر وہ احساسات و تاثرات، جذبات اور قلبی واردات میں بالکل بزرگوں کے ساتھ شریک رہتے ہیں اور ان کے دلوں کے اندر ولولوں کا طوفان بھی اٹھتا ہے۔ اور منصوبوں کی عمارتیں بھی کھڑی ہوتی ہیں اور اس وقت کے تاثرات و تصورات کے نقوش اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ وہ مٹا نہیں کرتے۔

یقیناً یہ اتنا زندگی کا دور امام حسن (ع) کے دل و دماغ میں عام انسانی فطرت کے لحاظ سے ولولہ و ہمت کی لہروں میں تھوڑا سا موج ہی پیدا کرنے والا تھا سکون پیدا کرنے والا نہیں مگر اس سات آٹھ سال کے بعد ایک دم ورق الٹا ہے۔ اب یہ منظر سامنے ہے کہ باپ گوشہ نشین ہیں۔ اور ماں گریہ کناں۔ وہ تمام ناگوار حالات سامنے ہیں جن کا اظہار کسی کے لئے پسندیدہ ہے یا ناپسند۔ بہر حال تاریخ کے اندر وہ موجود اور ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں۔ یقیناً اگر حضرت علی بن ابی طالب (ع) کا دس برس کی عمر کے بعد ۱۳ برس رسول کے ساتھ رہ کر مکہ کی خاموش زندگی میں خاموشی کے راستے پر قائم رہنا ایک جہادِ نفس تھا تو محسن مجتبیٰ کا بھی ۸ برس کی عمر کے بعد پچیس سال باپ کے صبر و استقلال کے ساتھ ہم آہنگ رہنا ان کا ایک عظیم جہاد تھا۔ وہاں علی (ع) کے سامنے ان کے مربی رسول کے جسم پر پتھر پھینکے جاتے تھے اور وہ خاموش تھے اور یہاں حسن (ع) کے سامنے ان کے باپ علی بن ابی طالب (ع) کے گلے میں رسی باندھی جاتی ہے اور مادر گرامی کے دروازے پر آگے لگانے کے لئے لکڑیاں جمع کی جاتی ہیں اور انہیں ہر طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں اور حسن مجتبیٰ (ع) خاموش ہیں۔ اسی خاموشی میں آٹھ برس سے اٹھارہ برس اور اٹھائیس برس سے اٹھائیس برس بلکہ سات آٹھ برس کی عمر کے بعد ۲۵ سال میں ۳۳ برس کے ہوئے مگر وہ جس طرح ساتھ آٹھ برس کے بچپن کے دور میں حضرت علی بن ابی طالب (ع) کے ساتھ ایک کم عمر بچہ کی طرح تھے بالکل اسی شان سے اٹھارہ اور اٹھائیس اور تیس

بتیس برس کی عمر کے جوان ہو کر بھی ہیں۔ مسلک ہے تو باپ کا طریقہ کار ہے تو باپ کا۔ نہ ان کے بچپن میں کوئی نادانی کا قدم اٹھتا ہے نہ جوانی میں کوئی جوش کا اقدام اٹھتا ہے پھر حضرت علی (ع) نے خاموشی کے ماحول میں آنکھ ہی کھولی تھی اور امام حسن (ع) تو آٹھ برس کی عمر اس جنگ کے ماحول میں گزار چکے تھے جس سے شجاعانہ اقدامات کو طبیعت میں رس بس جانا چاہئے اس کے بعد ۲۵ سال اس طرح گزار رہے ہیں۔ اتنی طولانی مدت کے اندر کبھی جوش میں نہ آنا۔ اپنے ہم عمروں سے کبھی تصادم نہ ہونا کسی دفعہ بھی ایسی کوئی بات نہ ہونا جو مصلحت علی (ع) کے خلاف ہو۔ یہ ان کی زندگی کا کارنامہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تاریخ کی دھندلی نگاہ حرکت کو دیکھتی ہے سکون کو نہیں۔ آندھیوں کو دیکھتی ہے سناٹے کو نہیں۔ شورش طوفان دیکھتی ہے سمندر کے سکون پر نظر نہیں ڈالتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس دور کے فتوحات جو اکثریتی طاقت نے کئے جزو تاریخ بن گئے اور اسلام کی جو خدمت خاموش رہ کر کی گئی اور اس کے جو نتائج ہوئے وہ تاریخ میں کہیں نظر نہ آئیں گے بہر حال اب یہ ۲۵ سال گزرے اور وہ وقت آیا جب حضرت علی بن ابی طالب (ع) برسرِ اقتدار ہیں اس کے بعد جمل صفین اور نہروان کے معرکے ہیں اور حضرت امام حسن (ع) ان میں اپنے والد بزرگوار حیدر کرار (ع) کے ساتھ ساتھ ہیں۔

حسن کے ہاتھ میں جمل کی لڑائی میں تلوار اسی طرح پہلی بار ہے جس طرح بدر میں علی (ع) کے ہاتھ میں پہلی بار۔ مگر جیسے انہوں نے پہلی ہی لڑائی میں شجاعانہ آزمودہ کار پر اپنی فوقیت ثابت کر دی ویسے ہی جمل میں جو کارنامہ دوسروں سے نہیں ہوتا وہ حسن مجتبیٰ (ع) اپنی تلوار سے کر کے دکھا دیتے ہیں۔ اسی طرح صفین میں ایسا معیاری نمونہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت امیر (ع) اپنے فرزند محمد حنیفہ (ع) کے لئے اسے مثال قرار دیتے ہیں او جیسا کہ دینوی نے 'الاخبار الطوال' میں لکھا ہے ایک ایسے موقع پر جب لشکر امیر المومنین (ع) کے ایک بڑے حصہ نے شکست کھائی تھی، یہ اپنے باپ کے سامنے اس طرح تھے کہ انہیں تیروں سے بچا رہے تھے اور خود اپنے کو تیروں کے سامنے پیش کئے دیتے تھے۔

مخالف حکومت کا پروپیگنڈا بھی کیا چیز ہے؟ اس نے حکایتیں تصنیف کی ہیں کہ حسن مجتبیٰ (ع) تو طبعاً صلح پسند تھے۔ مگر ان کی بے جگری کے ساتھ ان نبرد آزمائیوں میں عملی شرکت ان تصورات کو غلط ثابت کر دیتی ہے۔

جنگ جمل میں کوفہ والوں کو ابو موسیٰ اشعری نے جو وہاں حاکم تھے نصرت امیر المومنین (ع) سے روک دیا تھا۔ یہ حسن مجتبیٰ ہی تھے جنہوں نے جا کر تقریر کی اور پورے کوفہ کو جناب امیر (ع) کی نصرت کے لئے آمادہ کر دیا۔

ہاں جب صفین میں نیزوں پر قرآن اٹھائے گئے اور امیر المومنین (ع) نے حالات سے مجبور ہو کر معاہدہ تحکیم پر دستخط کئے تو جوان سال بیٹے حسن (ع) و حسین (ع) دونوں باپ کے ساتھ اس معاہدہ میں بھی شریک تھے بالکل جس طرح حضرت امیر پیغمبر خدا کے ساتھ ساتھ تھے جنگ اور صلح دونوں میں۔ اسی طرح حسن (ع) و حسین (ع) اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ہر منزل میں شریک نظر آتے ہیں۔

جب ۲۱ ماہ رمضان ۴۰ھ کو جناب امیر (ع) کی وفات ہو گئی اور حضرت امام حسن (ع) خلیفہ تسلیم کئے گئے تو آپ نے خود بھی حاکم شام کے خلاف فوج کشی کی۔ اور فوجوں کو لے کر روانہ بھی ہوئے اور اس طرح بھی ثابت کر دیا کہ راستہ آپ کا وہی ہے جو آپ کے والد بزرگوار کا راستہ تھا۔

اب اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ حالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل کوفہ کی اکثریت جنگ نہروان کے بعد سے جناب امیر (ع) کے ساتھ ہی سردمہری برتنے لگی تھی اور جنگ سے عاجز آچکی تھی جس پر خود

حضرت علی بن ابی طالب(ع) کے اقوال جو نہج البلاغہ میں مذکور ہیں، گواہ ہیں اس کا علم حاکم شام کو بھی اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے ہو گیا تھا چنانچہ حضرت امیر(ع) کے بعد انہوں نے اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے بہت سے روسائے کوفہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ان لوگوں نے خطوط بھیجے کہ آپ عراق پر حملہ کیجئے اور ہم یہاں ایسی تدبیر کریں گے کہ حضرت امام حسن(ع) کو قید کر کے آپ کے سپرد کر دیں۔

معاویہ نے یہ خطوط بجنسہ حضرت امام حسن(ع) کے پاس بھیج دیئے۔ پھر بھی وہ جانتے تھے کہ حضرت امام حسن(ع) کوئی ایسی صلح کبھی نہ کریں گے جس میں ان کے نقطہ نظر سے حق کا تحفظ نہ ہو۔ اس لئے انہوں نے اس کے ساتھ ایک سادہ کاغذ بھیج دیا کہ جو شرائط آپ چاہیں اس پر لکھ دیں میں انہیں منظور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ان حالات میں جب کہ اپنوں کا حال وہ تھا اور مخالف یہ رویہ اختیار کر رہا تھا جنگ پر قائم رہنا ایک بلاوجہ کی ضد ہوتی جو آل رسول کی شان کے خلاف تھی۔

حضرت پیغمبر خدا نے تو حدیبیہ میں امن وامان کی خاطر مشرکین کے پیش کردہ شرائط پر صلح کی جسے سطحی نگاہ والے مسلمان سمجھ رہے تھے کہ یہ دب کر صلح ہے اور امام حسن نے جو صلح کی وہ ان شرائط پر جو خود آپ نے پیش کئے تھے اور جنہیں فریق مخالف سے منظور کرایا۔

ذرا اس صلح نامہ کے شرائط میں نظر ڈالئے۔ اس کی مکمل عبارت علامہ ابن حجر مکی نے صوائق محرقہ میں درج کی ہے۔

اس میں شرط اول یہ ہے کہ حاکم شام کتاب و سنت پر عمل کریں گے اس شرط کو منظور کرا کے حضرت امام حسن(ع) نے وہ اصولی فتح حاصل کی ہے جو جنگ سے حاصل ہونا ممکن نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ صلح نامہ کے شرائط میں بنیادی طور پر ایسی ہی چیز درج ہوتی ہے جو بنائے مخاصمت ہو۔ حضرت امام حسن(ع) نے یہ شرط لگا کر ثابت کر دیا کہ ہماری بنائے مخاصمت معاویہ سے کوئی ذاتی یا خاندانی نہیں ہے بلکہ وہ صرف یہ ہے کہ ہم کتاب اور سنت رسول پر عمل کے طلب گار ہیں اور یہ اس سے اب تک منحرف رہے ہیں۔ پھر صلح نامہ کی دستاویز تو فریقین میں متفق علیہ ہوا کرتی ہے۔ وہ دونوں فریق اس کے کاتب ہوتے ہیں۔ یہ شرط درج کر کے امام حسن(ع) نے حاکم شام سے تسلیم کرا لیا کہ اب تک حکومت شام کا جو کچھ رویہ رہا ہے وہ کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس شرط کی کیا ضرورت تھی؟

غلط اندیش دنیا کہتی ہے کہ امام حسن(ع) نے بیعت کر لی۔ میں کہتا ہوں۔ اگر حقیقت پر غور کیجئے تو جب امام حسن(ع) شریعت اسلام کے محافظ ہیں اور آپ نے اس کا اقرار حاصل کیا ہے کہ حاکم شام کتاب اور سنت کے مطابق عمل کریں گے تو اب یہ فیصلہ آسان ہے کہ جس نے شرائط مانے اس نے بیعت کی یا جس نے شرائط منوائے اس نے بیعت کی۔ حقیقت میں حضرت امام حسن(ع) نے تو بیعت لے لی۔ خود بیعت نہیں کی۔ دوسری شرط یہ تھی کہ تمہیں کسی کو اپنے بعد نامزد کرنے کا اختیار نہ ہو گا اس طرح حضرت امام حسن(ع) نے برفرض مخالفت شرط اول اس ضرر کو جو حاکم شام کی ذات سے مذہب کو پہنچتا محدود بنایا اور آئندہ کے لئے یزید ایسے اشخاص کا سدباب کر دیا۔

خواہاں حاکم شام زیادہ نمایاں طور پر یہ شرط پیش کرتے ہیں کہ حضرت امام حسن(ع) نے سالانہ ایک رقم مقرر کی تھی کہ یہ تمہیں ادا کرنا ہو گی میں کہتا ہوں کہ یہ شرط اگرچہ مسلم نہیں ہے پھر بھی اگر یہ شرط رکھی ہو تو یہ آئینی حیثیت سے اپنے اصلی حقدار حکومت ہونے کے اعتراف کا فریق مخالف کے عمل سے قائم رکھنا ہے اور اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو حضرت رسول خدا کا نصاریٰ سے جزیہ لے کر جنگ کو ختم کر دینا درست ہے تو حضرت امام حسن(ع) کا حاکم شام پر سالانہ ایک ٹیکس عائد کرنا بھی بالکل صحیح ہے۔ یہ عملی مظاہرہ

ہے اس کا کہ ہم نے دب کر صلح نہیں کی ہے بلکہ خونریزی سے بچنے کی ممکن کوشش کی ہے۔
 حضرت امام حسن (ع) کو اس صلح پر برقرار رہنے میں بھی کتنے شداں اور زخم ہائے زبان کا مقابلہ کرنا پڑا ہے
 مگر مفادِ دینی کے لئے یہ صلح ضروری تھی تو پُرجگری کے ساتھ حضرت (ع) تمام ایذاء و اہانت کے صدموں کو
 برداشت کرتے رہے۔ اور دس برس مسلسل پھر گوشہ نشینی کے ساتھ زندگی گزار کر حضرت علی بن ابی طالب (ع)
 کے ۲۵ سال کے دور گوشہ نشینی کا مکمل نمونہ پیش کر دیا۔

اموی ذہنیت والوں کا یہ پروپیگنڈا کہ حسن مجتبیٰ (ع) اپنے والد بزرگوار حضرت علی بن ابی طالب (ع) اور اپنے
 چھوٹے بھائی حضرت امام حسین (ع) سے مختلف ذہنیت رکھتے تھے اور وہ صلح ان کی انفرادی افتاد طبع کا
 نتیجہ تھی۔ خود اموی حاکم شامی کے عمل سے بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ اگر یہ بعد والا پروپیگنڈا
 صحیح ہوتا تو اس مصالحت کے بعد حاکم شام کو حضرت امام حسن (ع) سے بالکل مطمئن ہو جانا چاہئے تھا
 بلکہ حاکم شام کی طرف سے واقعی پھر امام حسن (ع) کی قدرومنزلت کے مسلمانوں میں بڑھانے اور نمایاں
 کرنے کی کوشش کی جاتی۔ بلاتشبہ جس طرح مشہور روایات کی بنا پر جناب عقیل کو حضرت علی بن ابی
 طالب (ع) سے بظاہر جدا کرنے کے بعد ان کی خاطر داریوں میں کوئی وقیقہ فروگذاشت نہ کیا جاتا تھا۔ یہی بلکہ
 اس سے زیادہ حضرت امام حسن (ع) کے ساتھ ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ صلح کرنے کے بعد بھی امام حسن (ع) کو
 آرام اور چین نہیں لینے دیا گیا اور بالآخر زہر دغا سے آپ کو شہید کر دیا گیا۔ اسی سے ظاہر ہے کہ حاکم شام
 بھی جانتے تھے۔ کہ یہ رائے، مسلک، خیال اور طبیعت کسی اعتبار سے بھی اپنے باپ بھائی سے جدا نہیں ہیں۔ یہ
 اور بات ہے کہ اس وقت انہیں فرض کا تقاضا یہی محسوس ہوا لیکن اگر مصلحت دینی میں تبدیلی ہو تو یہی
 کوئی نیا صفین کا معرکہ پھر آراستہ کر سکتے ہیں اور انہی کے ہاتھ سے کربلا بھی سامنے آ سکتی ہے اسی لئے ان
 کی زندگی اس کے بعد بھی ان کے سیاسی مقاصد کے لئے خطرہ بنی رہی اور جب ان کی شہادت کی خبر ملی تو
 انہوں نے اطمینان کی سانس ہی نہیں لی بلکہ اپنے سیاسی ضبط و تحمل کے دائرہ سے بھی تجاوز کر کے بالاعلان
 انہوں نے مسرت سے نعرہء تکبیر بلند کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حسن مجتبیٰ (ع) کی صلح کسی مخصوص
 ذہنیت یا طبیعت کا نتیجہ نہیں تھی۔ وہ صرف فرض کے اس احساس کا تقاضا تھی جو انسانی بلندی کی معراج
 ہے۔